عامر سہیل* ڈاکٹر محمد الطاف یوسفزئی **

لسانیات اور اُسلوبیات : جدید تصورات کی روشنی میں

Abstract: *Stylistics is the natural outcome of linguistics. In the present article I have discussed not only the basic elements of linguistics but also have pin pointed the major themes of stylistical approaches in literature. Language models reflect some new dimensions of communications in which we can see how context, sender, contact, code and message play vital role in all type of communications. As stylistics is the scientific study of a literary text so here we can highlight all the major and minor characteristics of a specific text. Stylistics gives us a new paradigm for analyzing the literary texts on scientific grounds.*

دورِ جدید میں زبان، لسانیات، ادب، اُسلوب، اُسلوبیات اور ثقافتی مظاہر پر بہت زیادہ توجہ صرف کی جا رہی ہے۔ ان جدید مطالعات نے جہاں ادب کی ماہیئت و افادیت کے نئے زاویے روشن کیے وہاں ادب اور لسانیات کے مابین ایسے رشتوں کو بھی اُجاگر کیا گیا جو ماضی میں ہماری نظروں سے اوجھل رہے ہیں۔ لسانیات ایک ایسا ہمہ گیر شعبہء علم ہے جس کی وجہ سے ادب میں ساختیات، پس ساختیات، ردِ ساختیات، تانیثیت، ادبی تھیوری، نو آبادیات، صارفیت، جدیدیت، مابعد جدیدیت اور گلوبلائزیشن جیسے فکری موضوعات ہماری توجہ کا مرکز بن رہے ہیں۔ ان فکری مسائل کی گہرائی جانچنے کے لیے لازمی ہے کہ پہلے زبان، لسانیات اور اُسلوب و اُسلوبیات کی اصطلاحات اور ان کی تعریفات پر ایک اجمالی نظر ڈال لی جائے تاکہ تمام مباحث کو راست سمت میں جاری رکھا جا سکے۔ اس ضمن برجوہن دتاتریہ کیفی زبان کی تعریف پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "زبان تخیل اور خیال کے ظاہر کرنے کا ذریعہ ہے۔۔۔ ہمارا مقصد ناطقہ کے ذریعہ اظہار خیال ہے جس کا تعلق آواز سے ہے۔"(۱)

ڈاکٹر اقتدار حسین خان زبان کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "لسانیات کی رو سے زبان ایک ایسا خود اختیاری اور روایتی صوتی علامتوں کے نظام کو کہتے ہیں جو کوئی انسان اپنے سماج میں اظہارِ خیال کے لیے استعمال کرتا ہے۔ "(۲)

* پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالر، شعبہء اُردو، ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ
** اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہء اُردو، ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ

یہ دونوں تعریفیں اس بات کو واضح کرتی ہیں کہ زبان انسانی تمدن کا خود ساختہ وسیلہ ہے اور اس کی مدد سے انسان اپنے تمام خیالات اور خواہشات کی تشکیل کر سکتا ہے۔ زبان فطری عمل کا حصہ ہے جس میں انسانی سوچ اور عقل و شعور کا عمل دخل زیادہ ہے یہ ہمارا حیاتیاتی ورثہ ہے۔ زبان ایک طرف ہمارے رشتوں کا تعین کرتی ہے تو دوسری طرف تہذیب و ثقافت کی بنیاد گزار بھی ہے۔ محولہ بالا تعریفوں میں زبان کے عمومی مظاہر کی طرف تو واضح اشارے ملتے ہیں لیکن زبان کے علامتی پہلو پر کوئی بات نہیں کی گئی۔ اس کمی کو بڑی حد تک محمد ہادی حسین اپنی کتاب "زبان اور شاعری" میں پورا کرتے نظر آتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

> "زبان علامتوں کا ایک نظام ہے جو انسان کے باہمی ابلاغ کا وسیلہ ہے یا بن سکتا ہے۔ ان علامات میں ہر طرح کی حرکات بھی شامل ہیں اور ہر طرح کی سکنات بھی۔ حواسِ خمسہ میں سے ہر ایک کا ایک مجموعہ ء علامات وضع کیا جا سکتا ہے۔ اور تو اور اعضائے بدن سے مختلف قسموں کے اخراج بھی کام میں لائے جا سکتے ہیں، مثلاً آنسو، پسینہ، لعابِ دہن ۔۔۔ اس امر پر کہ زبان ایک نظامِ علامات کا نام ہے، لسانیات کے تمام دبستانوں کا اتفاق ہے۔"(۳)

ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے نزدیک زبان کی تعریف کچھ یوں ہے:

> "زبان انسانی خیالات اور احساسات کی پیدا کی ہوئی اُن تمام عضوی اور جسمانی حرکتوں اور اشاروں کا نام جن میں زیادہ تر قوت گویائی شامل ہے اور جن کو ایک دوسرا انسان سمجھ سکتا ہے اور جس وقت چاہے اپنے ارادے سے دہرا سکتا ہے۔"(4)

اگر ان تمام تعریفوں کو مدِ نظر رکھا جائے تو زبان کی تمام ابلاغی، آلاتی، وصفی، علامتی، نُطقی، اور صوتی صفات سامنے آ جاتی ہیں۔ زبان کو لسانی مفاہمہ کہنا زیادہ درست ہے کیوں کی اس میں معانی و مطالب کو قبول عام حاصل ہو جاتا ہے اور اس نظام سے منسلک انسانی گروہ اپنے روزمرہ معاملات میں سہولت محسوس کرتے ہے۔ زبان کا فکر کے ساتھ بھی گہرا تعلق ہے کیوں کہ انسان کی قوت گوئی نے بڑے بڑے علوم کو جنم دیا ہے اور اسی زبان نے معقولیت کو مستحکم کیا ہے۔

زبان کا سائنسی، معروضی اور منظم و مربوط مطالعہ لسانیات کہلاتا ہے۔ لسانیات کی اصطلاح عربی کے لفظ "لسان" سے ماخوذ ہے جس کے معنی زبان یا زبان کا علم ہے۔ انگریزی میں لسانیات کے لیے "Linguistics" کی اصطلاح مستعمل ہے۔ لسانیات میں زبان کی اصلیت، ماہئیت اور خصوصیات کا کھوج لگایا جاتا ہے لیکن زبان کے برعکس لسانیات کا مطالعہ غیر اقداری ہوتا ہے۔ لسانیات نے زبان کے نفسیاتی اور معاشرتی سروکار سے ہٹ کر اس کی بناوٹ اور ساخت کو موضوع بنایا ہے۔ زبان کا تفاعلی پہلو لسانیات ہی کی مدد سے سامنے آتا ہے۔ زبان کے سائنسی مطالعات کی روایت زمانہ ء قدیم سے چلی آ رہی ہے جو اپنی نوعیت اور طریقِ کار کی بدولت مذہبی اور فلسفیانہ زمروں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ قدیم ہند، یونان اور مصر میں فاضل حکما کی بدولت اس خاص شعبہ ء علم میں خاصی پیش رفت ہوئی جس کے اثرات

موجودہ عہد تک پھیلے نظر آتے ہیں۔ قدیم لسانیات کا زیادہ تر دارومدار لفظ کی ساخت، لغت، اور قواعد پر تھا۔ قدیم پانینی کی بھی اصل وجہء شہرت سنسکرت زبان کی قواعد نویسی ہے۔ قدیم یونان میں افلاطون، ارسطو اور سوفسطائی مکتبہ فکر بھی لسانیات سے گہری دل چسپی رکھتا تھا۔ افلاطون کی فکر نے لسانیات کے کئی مسائل کو اعیان ثابتہ کے ماتحت کر دیا تھا جب کہ ارسطو نے یہاں بھی خالص منطقی اور معروضی اُصولوں کی بنیاد پر اس کام کو آگے بڑھایا۔ خلیل صدیقی لکھتے ہیں :

> "ارسطو نے افلاطون کے برعکس زبان کے بنیادی کلموں کو زمروں میں تقسیم کیا اُس کا خیال ہے کہ زبان لفظ بہ لفظ بولی جاتی ہے کلمے کسی اُصول کے تحت منتخب ہوتے اور ترتیب پاتے ہیں۔۔۔کلمے "اعیان" کی تمثال نہیں بلکہ مدلول یا مشارٌالیہ پر دلالت کرنے والی صوتی علامتیں ہیں۔ اُس نے جملے کے تین اجزا بتائے، مبتدا، خبر اور کلماتِ ربط۔ "(۵)

ارسطو کی فراہم کردہ یہ تقسیم ہمارے لیے آج بھی اتنی ہی فائدہ مند ہے جتنی یہ اپنے دور میں تھی۔ اہلِ یونان کی مزید لسانی خدمات پر بات کرتے ہوئے خلیل صدیقی رقمطراز ہیں:

> "قدیم یونانیوں ہی نے دنیائے مغرب میں گریمر اور لسانیات کی ابتدائی روایتوں کی داغ بیل ڈالی۔ رومنوں نے یونانیوں سے استفادہ کیا۔ یونانی اور لاطینی کی لسانی اور قواعدی ہم آہنگی اور مماثلت نے استفادہ کی سہولتیں پیدا کر دی تھیں۔ یونان کے قواعدی نظام کو جزوی تبدیلیوں کے ساتھ اپنالیا گیا تھا۔ یونانی اصطلاحات کے لغوی ترجمے کیے گئے۔ یہی تراجم انگریزی اور دوسری یورپی زبانوں میں بھی اختیار کر لیے گئے۔" (۶)

عربوں کے ہاں لسانیات کا شوق اگرچہ مذہبی رجحانات کے زیرِ اثر رہا تاہم عربی زبان کے پہلے قواعد نویس ابوالاسود نے اس علم کی طرف جو توجہ کی اُس کا اثر بعد میں آنے والوں پر بہت واضح ہے۔ اس روایت کو آگے بڑھانے میں خلیل بن احمد، سیبویہ، الاصمعی، ابو عثمان المازنی، ابن جنی، ابن سینا اور جلال الدین سیوطی زیادہ معروف ہیں۔ ان اصحابِ علم کی وجہ سے قواعد، صرف و نحو، صوتیات، اشتقاقیات، مخارج کی دریافت، علم قافیہ اور تکلمی آوازوں کی تقسیم کے حوالے سے جو تحقیقات متعارف کرائی تھیں اُن کا اعتراف جدید دور میں بھی ہوتا رہا ہے۔ خلیل صدیقی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> "سیبویہ نے عربی کی تکلمی آوازوں کا تجزیہ کر کے اُن کے مخارج اور کیفیت کی بنیادوں جو تقسیم اور درجہ بندی کی ہے، جدید مغربی ماہرینِ صوتیات اس سے کم و بیش متفق ہیں۔ ڈبلیو ایچ گیرڈنر کی کتاب "The Phonetics of Arabic" میں کلاسیکی عربی آوازوں کی درجہ بندی سیبویہ کی تقسیم سے مختلف نہیں ہے"(۷)

لسانی تاریخ کا جائزہ یہ بات ثابت کرتا ہے کہ دنیا کے مختلف خطوں میں ایسے لوگ موجود رہے ہیں جنھوں نے زبان کے فنی اور تکنیکی پہلوؤں پر دادِ تحقیق دی ہے۔ اس تحقیقی روایت کے مستحکم ہونے کی وجہ سے لسانیات کے ماہرین نے زبان کی ہئیت، ساخت اور اس کے اصول و ضوابط کا تعین کیا۔ لسانیات اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک پیچیدہ اور قدرے گنجلک علم ہے اور اس کا دائرہ کار میں جو مباحث آتے ہیں وہ بھی عمومی دل چسپی کے نہیں ہوتے لیکن اس کے باوجود وقت گزرنے کے ساتھ اس میں قابلِ قدر اضافے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ جدید دور میں اضافوں کا یہ عمل ماضی کی نسبت خاصا تیز ہے۔ لسانیات کی جدید صورت ہمیں اٹھارھویں صدی کے آس پاس نظر آتی ہے جس میں جرمنی کے ہرڈر اور جنیش خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پادری جنیش نے اگرچہ دینیاتی ضروتوں کے تحت لسانیات پر لکھنا شروع کیا تھا لیکن اس کے اخذ کردہ نتائج کا اطلاق بڑی حد تک عمومی لسانیات پر بھی ہوتا ہے البتہ ہرڈر نے زبان کو منطقی قوانین کی روشنی میں سمجھنے اور سمجھانے کی کامیاب کوشش کی تھی۔ اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی سر ولیم جونز کا وہ تاریخی فکر انگیز مقالہ ہے جو انھوں نے "رائل ایشیاٹک سوسائٹی" کے زیر اہتمام 27 ستمبر 1786ء میں پڑھا اور لسانیات کے بنیادی اُصولوں کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرائی تھی۔ اس علمی مقالے کا حوالہ مرزا خلیل احمد بیگ نے اپنے تحقیقی مضامین میں دیا ہے اُن کے بقول ولیم جونز نے جو مقالہ پڑھا اُس میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا تھا:

> "سنسکرت، یونانی، لاطینی، کلٹک اور جرمانک ان تمام زبانوں میں چونکا دینے والی لسانی مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ جن کی وجہ سے ولیم جونز کو یہ نتیجہ اخذ کرنا پڑا کہ یہ زبانیں ضرور کسی ایک مشترک ماخذ سے نکلی اور ارتقا پذیر ہوئی ہیں، یہیں سے زبانوں کے تاریخی و تقابلی مطالعے کی باقاعدہ طور پر ابتدا ہوتی ہے۔"(۸)

تاہم اُردو زبان و ادب میں لسانیات کی ابتدا ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی کتاب "ہندوستانی لسانیات" سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد یہ موضوع بتدریج ایک مخصوص علمی حلقے میں مقبول ہونا شروع ہوا جس کے نتیجے میں کئی اچھے مقالات اور تصانیف منظر عام پر آتی چلی گئیں۔ ڈاکٹر زور کے علاوہ اُردو میں لسانیات کے حوالے سے جن ادبا نے بنیادی کام کیا اُن میں مسعود حسین خان، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر گیان چند، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر سہیل بخاری، خلیل صدیقی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر فہیم اعظمی، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، مرزا خلیل احمد بیگ، ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، ڈاکٹر محمد اشرف کمال اور ڈاکٹر ناصر عباس نیر قابل ذکر ہیں۔ یہ بات بظاہر بہت حیران کن ہے کہ اُردو کی نسبت ہندی میں لسانیات کا سرمایہ مقدار اور کیفیت کے حوالے سے خاصا ثروت مند ہے۔ ہندی ادیبوں کو بہت پہلے سے اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ لسانیات ایک اہم موضوع ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ اسی بصیرت نے اُن کے ہاں ابتدا ہی سے ایک ایسی سنجیدہ روش اختیار کی جو دورِ حاضر کے تازہ مسائل کو زیادہ بہتر تناظر میں سمجھ کر اُس کے مطابق اپنی حکمت عملی وضع کر سکتی ہے۔ دنیا کی دیگر مغربی زبانوں میں جن حکما نے لسانیات کے جدید ترین نظری اور عملی حوالے سے اہم خدمات انجام دیں اُن میں ساسیور، دریدا، بلوم فیلڈ، سپیوک، آرکی بالڈ ائے، ہائمز، سال سپورٹا، جان ہولینڈر اور رولاں بارتھ قابل ذکر ہیں۔

لسانیات ایک وسیع اور پیچیدہ موضوع ہے اس کی حدود اور وسعت کا اندازہ یہاں سے لگایا جاسکتا ہے کہ ادب کے علاوہ، تاریخ، نفسیات، عمرانیات، بشریات، فلسفہ، منطق اور اساطیر کے ماہرین اور محققین بھی اس میں گہری دل دلچسپی رکھتے ہیں۔ لسانیات کا یہی تنوع اسے ایک ہمہ گیر مضمون بناتا ہے اور ادب کی طرح اس کا دائرہ اثر بھی بین العلومی ہے۔ جے آر کینٹر اور جے بی واٹسن نے زبان کے نفسیاتی جبکہ آگڈن، رچرڈ ہارلینڈ، والا فوس جیسے فضلا نے زبان کے فلسفیانہ مسائل سے تعرض کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد اشرف کمال نے اپنی تصنیف " لسانیات، زبان اور رسم الخط " میں لسانیات کے مختلف ناموں کی روداد بھی بیان کی ہے، اُن کے مطابق یہ علم اپنے ابتدائی دور میں گلاسولوجی (Glossology) کہلایا بعد میں اس کے ناموں کا ارتقائی سفر تقابلی فلالوجی (comparative philology)، فلالوجی اور گلاٹولوجی سے ہوتا ہوا "Linguistique" تک پہنچا۔ یہاں سے آگے اسے "Linguistic" کا نام ملا جو کچھ عرصے کے بعد "Linguistics" بن کر عوام و خواص میں رواج پا گیا۔ البتہ ڈنمارک کے علمی حلقوں میں اس علم کے لیے "Glossematics " کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ ایک عمومی رائے کے مطابق کسی بھی زبان کا سائنسی مطالعہ لسانیات کہلاتا ہے تاہم مشرق و مغرب کے بہت سے حکما نے لسانیات کو اپنے فہم کے مطابق تعریفی حدود میں لانے کی جو کامیاب سعی کی ہے اُس پر نظر ڈالنا بھی بہت ضروری ہے۔ اُردو زبان میں لسانیات کے اولین بنیاد گزروں میں ایک اہم نام ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا ہے۔ وہ لسانیات کے بارے میں بتاتے ہیں:

> "لسانیات اُس علم کو کہتے ہیں جس کے ذریعے سے زبان کی ماہیت، تشکیل، ارتقا، زندگی اور موت کے متعلق آگاہی حاصل ہوتی ہو۔۔۔ زبانوں کا تجزیہ اُن کی تاریخ، اُن کے باہمی نقاطِ ارتباط، ان کی معنوی ساخت اور ان کی ظاہری تقسیم و گروہ بندی پر غور و خوض کرنا لسانیات کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ "(۹)

یہ تعریف لسانیات کے بہت سے اہم پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے جس سے یہ اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ لسانیات کوئی جامد طریق کار نہیں بلکہ لسانی جستجو کا ایک ایسا منظم عمل ہے جو نئے علوم سے ہم آہنگ ہو کر زبان کے بنیادی اظہاریوں کو منکشف کرتا ہے۔ ڈاکٹر حامد اللہ ندوی لسانیات کی مزید صفات پر روشنی ڈالتے ہوئے بتاتے ہیں:

> "زبان کے مختلف پہلوؤں کا فنی مطالعہ لسانیات کہلاتا ہے۔ زبان کا یہ فنی مطالعہ عہد وزمانی (Diachronic) بھی ہو سکتا ہے اور ایک زمانی (Synchronic) بھی۔ دوزمانی مطالعے کی حیثیت تاریخی ہوتی ہے جس میں کسی زبان کی عہد بہ عہد ترقی یا مختلف ادوار میں اس کی نشوونما کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور ایک زمانی مطالعہ کی حیثیت توضیحی ہوتی ہے جس میں ایک خاص وقت یا خاص جگہ میں ایک خاص زبان جس طرح بولی جاتی ہے اُس کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ "(۱۰)

اُردو ادب میں اور خصوصاً لسانیات کے حوالے سے اس طرح کے مطالعات کا فائدہ بقول ڈاکٹر محمد اشرف کمال یہ ہوا ہے:

"لسانیات نے زبان کی ماہیت کے شعور کو عام کیا ہے۔ لسانیات نے زبان کو قصہ کہانیوں کی فرضی دنیا سے نکال کر اسے سائنس کی معروضی روشنی میں پیش کیا ہے،اور اس کی اصل سے پردہ اٹھایا ہے۔۔۔لسانیات کی مدد سے قدیم سے قدیم اور جدید سے جدید تر ادب کی تفہیم و تشریح میں آسانی ہو جاتی ہے۔ اس کی مدد سے ہم کسی زبان کی قواعد اور اس میں موجود دوسری زبانوں کے الفاظ و تراکیب کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔۔۔یہ مختلف زبانوں، انسانوں اور انسانی معاشروں کے درمیان پائے جانے والے تعلق اور باہمی رشتوں کی بازیافت کا کارنامہ سرانجام دیتی ہے۔"(۱۱)

لسانیات کی نوعیت تجربی سائنس جیسی ہے جس میں سمعیات اور عضویات کا عمل دخل بھی دیکھا جاسکتا ہے، لیکن اس شعبہء علم کے فیصلے اور نتائج اُس طرح حتمی نہیں ہوتے جیسا کہ متعلقہ سائنسوں میں عموماً نظر آتے ہیں۔ یہاں اخذِ معنی اور علامتوں کی تفہیم و ترسیل میں اختلافات ہوسکتے ہیں۔ خلیل صدیقی اسی خدشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس علم (لسانیات) کا ایسا حتمی جائزہ جو رویے، کیفیت اور جامعیت کے لحاظ سے تمام مکاتبِ فکر کے لیے قابلِ قبول ہو، ممکن نہیں۔"(۱۲)

دورِ جدید میں لسانیات اب کوئی ایسا سادہ علم نہیں رہا کہ جس میں محض زبان کے صوتی اور تکلمی معاملات کی چھان پھٹک کی جاتی ہے بلکہ اس نے اساطیر، فلسفہ، تاریخ، سماجی مطالعات، تخلیقی ادب اور لوک کہانیوں کے مطالعات کو نیا رُخ دیا ہے۔ یہ شعبہء علم زبان کے علامتی ابلاغ کو جن زاویوں سے دیکھ رہا ہے وہ ماضی سے یکسر مختلف ہے کیوں کہ اب اِن تمام اظہاریوں کو یک زمانی اور کثیر زمانی عوامل کے طور پر سمجھنے کی روش عام ہوتی جارہی ہے۔ اُردو لسانیات کے اولین اور اہم بنیاد گزار ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اپنی تصنیف "ہندوستانی لسانیات" (طبع اول 1932ء) میں میں لسانیات کے فوائد پر بات کرتے ہوئے جو باتیں کی تھیں وہ اکیسویں صدی میں ہونے والی جدید تحقیقات کی روشنی میں آج بھی اطلاقی مفہوم کا درجہ رکھتی ہیں:

"لسانیات کا مطالعہ عملی طور پر فائدہ مند ثابت ہوا ہے۔ قدیم قوموں کے عادات و اطوار اور رسم و رواج کی نسبت معلومات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ قدیم زبان ہے جس کے پراگندہ نمونے ان قوموں کے باقی ماندہ افراد کے سینوں میں صدیوں بعد تک محفوظ رہتے ہیں اور جو لسانیات کی مدد سے منضبط اور منظم ہو کر تشریح حاصل کرتے ہیں۔"(۱۳)

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لسانیات کا پھیلاؤ اپنی معنویت کو مستحکم کرتا چلا جارہا ہے۔ لسانیات کہیں کلی طور پر اپنے علمی فرائض پورے کر رہی ہے اور کہیں جزوی حوالے سے اپنی اہمیت اور افادیت ثابت کرتی چلی جارہی ہے۔ اگر اس کی جزوی حیثیت کے صرف ایک رُخ" قواعد "کو ہی لیا جائے تو نوم چامسکی کا پیش کردہ تشکیلی گرائمر کا نظریہ اپنے ابتدائی مراحل میں ہونے کے باوجود ریاضی

داں، منطقیوں، اور برقیات و سمیات کے ماہرین کے لئے کشش کا باعث ہے اور وہ دن دور نہیں جب کمپیوٹری لسانیات کی وساطت سے مشینی ترجمہ ہماری روز مرہ زندگی کا عام حصہ بن جائے گا۔ ناصر عباس نیر لسانیات کے ثمرات پر بات کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

> "لسانیات محض زبان کا قواعدی اور زبان کی تاریخی تبدیلیوں کا مطالعہ نہیں ہے، لسانیات کے ذریعے لفظ اور دنیا (ڈسکورس اور موضوع ڈسکورس) کے رشتے کو بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ جو رشتہ دراصل زبان کی وجہ سے اور زبان کے اندر وجود رکھتا ہے، لہٰذا زبان کی ساخت کے مطالعے سے لفظ اور دنیا کے ان رشتوں کو سمجھا جا سکتا ہے، جو مختلف ڈسکورسز اور نشانیاتی نظاموں کی اساس ہیں۔"(۱۴)

جدید لسانیات نے ادب، انسان اور سماج کے روایتی مفاہیم کو بڑی حد تک بدل ڈالا ہے جس کی وجہ سے سائنسی اور سماجی علوم و فنون میں فکر و نظر کے نئے اور کشادہ در وا ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ لسانیات میں زبان کی چار بنیادی سطحیں ہیں جو آگے چل کر مزید کئی گروہوں میں بٹ جاتی ہیں۔ یہ چار سطحیں درج ذیل ہیں:

۱-صوتیات (Phonology)

۲-لفظیات (Morphology)

۳-نحویات (Syntax)

۴-معنیات (Semantics)

لسانیات کا علم اپنی نوعیت، طریقِ کار اور مقاصد کے اعتبار سے کئی ذیلی شاخوں میں منقسم ہے۔ جو عمومی لسانیات، اطلاقی لسانیات اور عصری لسانیات کے مراحل طے کرتا ہوا مزید عنوانات قائم کرتا ہے۔ ان میں توضیحی لسانیات، تاریخی لسانیات اور تقابلی لسانیات کی حیثیت بنیادی ستون جیسی ہے۔ لسانیات کی باقی عمارت انھی ستونوں پر منحصر ہے جس میں تجزیاتی لسانیات، اطلاقی لسانیات، عمرانی لسانیات، بشریاتی لسانیات، نفسیاتی لسانیات، ثقافتی لسانیات، سماجی لسانیات اور اُسلوبیات زیادہ نمایاں ہیں۔ مذکورہ اقسام کا اپنا اپنا علمی دائرہ کار ہے جس کی حدود میں رہ کر دنیا کو اپنے نتائج علمیہ سے مستفید کرتے ہیں۔ البتہ تجزیاتی لسانیات میں صوتیات(Phonology) کا شعبہ قدرے زیادہ تکنیکی ہے کیوں اس میں زبان کی باریکیوں کو دریافت کیا جاتا ہے جس میں فونیمیات، مارفیمیات (صرف) اور مارفونیمیات جیسے امور طے پاتے ہیں۔ دورِ جدید میں لسانیات کا علم اور اس کا دائرہ عمل اتنا پھیل چکا ہے کہ اس میں دوسرے علوم و فنون بھی کسی نہ کسی حوالے سے زیر بحث آنے لگتے ہیں جس کی وجہ سے یہ شعبہء علم بین العلومی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ لسانیات کے جدید ترین مطالعات میں فلسفہ، نفسیات، ریاضی، علم الاعصابیات(Neorology)، سیاسیات، طبیعیات، موسیقی، تاریخ، عمرانیات، حیاتیات، اساطیر اور بشریات کا ذکر اب ایک عام سی بات بنتی جا رہی ہے۔ لسانیات پر جہاں سماجی علوم کے گہرے اثرات مرتب ہو رہے ہیں وہاں خالص سائنسی علوم کا اثر بھی اتنا واضح ہے کہ کئی علمی حلقوں میں یہ بحث بھی چل رہی ہے کہ کیا لسانیات ایک مکمل سائنسی علم ہے؟ بالخصوص صوتیات کے حوالے سے طبیعیات کے بعض شعبوں مثلاً "Acoustics" کا عمل دخل اتنا زیادہ ہے کہ

اصوات کی جانچ پرکھ کے لیے لیبارٹریوں میں اُسی طرح کی تیاری اور اُصول سازی کی جارہی ہے جس طرح کسی بھی سائنسی مسائل کے لیے ہوتی ہے، یعنی دونوں کا پروٹوکول کم و بیش ایک جیسا ہے۔ یہاں بھی حقائق کی بازیافت کے لیے مشاہدہ، مفروضات، استقرائی طریقِ کار، تجربی عمل، اعداد و شمار، اصول سازی اور استنتاج (Inference) کے ذریعے حتمی نتائج تک رسائی حاصل کی جاتی ہے۔ لسانیات میں نظریات وضع کرنے کا چلن عام ہے جو نوبہ نو تجرباتی عمل سے گزر کر عمومی اُصول (Generalizations) تک جا پہنچتے ہیں۔ لسانیات بسااوقات اپنے نتائج کی جمع آوری میں الجبری طریق بھی استعمال کرتی ہے۔

اُسلوبیات کی بنیاد چوں کہ لسانیات پر استوار ہے اس لیے لسانیات میں شامل تمام دیگر مضامین بھی کسی نہ کسی حوالے سے اُسلوبیات کے دائرہ اثر میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے تمام سماجی علوم و فنون (مثلاً عمرانیات، علم الانسان، نفسیات اور سیاسیات وغیرہ) جو انسان کے فکری اور عملی جہات سے منسلک ہیں اُن کا ایک واضح عکس ہمیں اُسلوبیات میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ تنقید ایک ایسی علمی اور تخلیقی سرگرمی ہے جس میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نئے اضافے ہوتے رہتے ہیں۔ ان اضافوں کا اصل مقصد یہی ہوتا ہے کہ متن کی دنیا کو زیادہ سے زیادہ سمجھا اور پرکھا جاسکے۔ تنقید کے روایتی دبستانوں میں متن کی تفہیم کا بڑا ذریعہ ذاتی پسند و ناپسند، ذوق اور مزاج ہوا کرتے تھے۔ اس قسم کی تنقید بالعموم یک رخی ہوتی تھی اور ہر نقاد اپنی سہولت کے مطابق فیصلے صادر کرتا تھا۔ اس دور کی تنقید کا ایک نمایاں کمزور پہلو یہ تھا کہ اگر کسی بڑے ناقد نے کسی تصنیف یا صاحبِ تصنیف کے بارے میں جو رائے قائم کر دی پھر وہ حتمی متصور ہوتی تھی اور بعد میں آنے والوں کے لیے اس رائے کا احترام فرائض میں شامل ہو جاتا تھا۔ یہ طریق ہائے تنقید آہستہ آہستہ اپنی ساکھ کم کرتے گئے اور ان کی جگہ تنقید کے ایسے نئے نظریات متعارف ہونا شروع ہوئے جن کی مدد سے متن کی اہمیت اور اُس کی تفہیم میں سہولت پیدا ہونا شروع ہو گئی۔ تنقید کی یہی آزادہ روی ادبی شعور میں استحکام پیدا کرتی ہے۔ تنقید کے انھی معاملات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

> "کسی ادب پارے کی صحیح قدر و قیمت اس وقت متعین ہوتی ہے جب اس کے تمام مضمرات روشنی میں آ جائیں، جن کا تعلق بہ یک وقت فکر و نظر، مواد، ہیئت، موضوع و اُسلوب اور لفظ و معنی دونوں سے ہوتا ہے۔ یہی ادب کا جامع اور تعمیری نقطہء نظر ہے اور ہر اچھی تنقید اسی کو مدِ نظر رکھتی ہے"(۱۵)

اُسلوبیات کا جدید دبستان تنقید کے اسی جامع تصور کی ایک توسیع ہے۔ اس میں متن کا مطالعہ تخلیق کار کے اُسلوب کا توضیحی اشاریہ کچھ اس انداز سے مرتب کرتا ہے کہ اس میں اُسلوب کے صوتی، صرفی، لغوی، نحوی، قواعدی اور معنیاتی صفات روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اُسلوبیات نے ادب اور لسانیات کے درمیان ہم رشتگی کا گہرا شعور عطا کیا ہے۔ تنقید کا یہ اندازِ نظر خالص منطقی اور معروضی ہوتا ہے تاہم اس میں کسی حد تک تاثراتی اور جمالیاتی زاویے بھی شامل سمجھے جاسکتے ہیں۔ اُسلوبیات کے جدید مفہوم، طریقِ کار اور تجزیات کے حوالے سے نظری مباحث کا سلسلہ جس شد و مد سے جاری و ساری ہے اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ہمارے اُردو نقاد تنقید کے نئے عالمی مباحث میں کس قدر دل چسپی رکھتے ہیں۔ جدید دنیا کا تصور اب ایک قریہء آفاقی کی صورت کیا جانے لگا ہے جس کی وجہ سے فکر و

نظر کی دنیا میں بھی ہل چل مچ گئی ہے کیوں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی نے کئی مصنوعی حد بندیوں کا خاتمہ کر دیا ہے اور بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ:

> "ہم مشرق کے باسی ہوں یا مغرب کے، اس دنیا کے بھی تو باسی ہیں۔ یہ کرہ ارض ایک ہے۔ سائنس ہو یا علوم کی روایت کچھ دریافتیں، کچھ فکری پیش رفت اس نوعیت کی ہے کہ کُلی انسانی روایت کا حصہ بن جاتی ہے، اس سے ہم استفادہ کیوں نہ کریں؟ اگر دوسری قومیتوں کا اس پر حق ہے تو ہمارا کیوں نہیں۔"(۱۶)

اُردو ادب میں عالمی ادبیات کے اثرات تلاش کرنا مشکل نہیں ہے۔ ہماری تنقید اور پھر دیگر اصناف مثلاً افسانہ، ڈرامہ، ناول اور آزاد نظم پر انگریزی، فارسی، فرانسیسی، جرمن اور روسی ادب کا اثر کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ ہائیکو جیسی بدیسی جاپانی صنف ہمارے ہاں قبولِ عام کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ یہی عالمی اثرات ہمیں جدید تنقید پر نظر آتے ہیں جس کا سلسلہ حالیؔ اور آزادؔ سے چلتا ہوا دورِ حاضر تک آ پہنچتا ہے۔ مغربی کی تنقیدی روایت نے اُردو تنقید کے سفر کو جس انداز سے تیز بنایا اور نئے نئے افکار کی ترویج و ترقی میں جو مثبت کردار ادا کیا اس کا ذکر اکثر و بیشتر ہوتا ہی رہتا ہے۔ ڈاکٹر خورشید جہاں نے اپنے پی ایچ ڈی کے پراجیکٹ "جدید اُردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات "(17) میں اس اہم ادبی مسئلے کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور مغربی اثرات کی پوری روایت کو سامنے لانے کی کامیاب سعی کی ہے۔ بعد میں پھر ڈاکٹر رفعت اختر خان اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے "اُردو تنقید پر عالمی اثرات" (18) کے ذریعے اُن تمام مرکزی تحریکوں اور رجحانات کو سامنے لایا جس نے اُردو تنقید کو ثروت مند بنانے میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔ اب اس امر میں کوئی شبہ باقی نہیں رہنا چاہیئے کہ اُردو تنقید کا نیا اُسلوبیاتی دبستان بڑی حد تک مغربی افکار و نظریات کا مرہونِ منت ہے۔ البتہ اس کے ابتدائی نقوش مشرقی اندازِ نقد میں کہیں کہیں ضرور نظر آجاتے ہیں۔ اُسلوبیات میں لسانیات کا عمل دخل اس حد تک حاوی ہے کہ اب کوئی بھی فیصلہ کرنے سے قبل یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ خود لسانیات اس ضمن میں کیا کہتی ہے۔ خوش آیند بات یہی ہے کہ زبان کے جدید تصورات نے اُسلوبیات کو ادب فہمی کا ایک موثر ذریعہ بنا دیا ہے۔ زبان کی داخلی اور خارجی معنویت کے بارے میں ڈاکٹر نصیر احمد خان کا کہنا ہے:

> "ادبی زبان فکری ترسیل کا نام ہے۔ جس کے ایک طرف تخلیق کار اور دوسری طرف قاری یا سامع ہوتا ہے۔ اسی زبان کے ذریعے ایک یا شاعر اپنی ذات، قاری، تخلیقی اور حقیقی دنیا کے درمیان رشتہ قائم کرتا ہے۔ ادب کی زبان کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں۔ کبھی وہ علامتی (Symbolic) ہو جاتی ہے تو کبھی ترسیلی (Expressive) اور کبھی حوالہ جاتی (Referential) یا جمالیاتی (Aesthetic) اُسلوبیات اپنے مطالعے کے وقت ادبی زبان کے نہ صرف ان پہلوؤں پر توجہ دیتی ہے بلکہ اس میں پوشیدہ جمالیاتی خصوصیات کا بھی جائزہ لیتی ہے۔"(۱۹)

اُسلوبیاتی مطالعات میں زبان کا وہ بنیادی وصف سامنے آتا ہے جس میں آوازوں، لفظوں اور ساخت کو نئے نئے زاویوں سے دیکھا اور پرکھا جاتا ہے۔ متن کا یہ معروضی مطالعہ جہاں ایک طرف تخلیقی ہیئت کو واضح کرتا ہے وہاں تہذیبی، اخلاقی اور عصری لسانی حسیت پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ تخلیقی متن ایک ایسا لسانی کُل تشکیل دیتا ہے جس کے باطن میں اتر کر اُس لسانی ساخت اور اُن سے منسلک رشتوں کو منکشف کرنا ممکن ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے متن لغت سے اُوپر اُٹھ کر اپنے معنوں میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔ ادبی زبان میں ساخت یا بناوٹ کو اساسی اہمیت حاصل ہے کیوں کہ یہاں زبان کی ترسیل اور اُس سے وابستہ معنی در معنی کا ایک ایسا بے انت سلسلہ شروع ہوتا ہے جو قاری کے لیے ایک چیلنج بن جاتا ہے۔ اب یہ اُسلوبیات کا کام ہے کہ وہ ادبی فن پارے کی اُس مخصوص خاصیت کا کھوج لگائے کہ زبان کس طرح عام بول چال کی سطح سے بلند ہو کر نئے نئے معنی پیدا کرنے کے بعد معنی کا یہ سلسلہ ملتوی کرتی چلی جاتی ہے۔ ادبی زبان میں الفاظ کی اس خاص کیفیت کے لیے "Foregrounding" کی اصطلاح برتی جا رہی ہے۔ یہ اصل میں ادبی اور تخلیقی زبان کا عمومی اظہاریوں سے انحراف کا عمل ہے۔ لسانی انحراف کا یہ عمل جتنا زیادہ ہو گا اُسی تناسب سے فور گراؤنڈنگ کا عمل زیادہ رنگارنگ اور وسعت پذیر ہوتا چلا جائے گا۔ یہ انحراف بہ یک وقت کئی سطحوں پر متحرک ہوتا ہے اور اس کا مشاہدہ لفظ کے صوری و معنوی تغیرات کے ساتھ ساتھ استعارے اور محاورے کے استعمال میں بھی مضمر ہوتا ہے۔ جملے کی نحوی اور قواعدی ترتیب و تنظیم کے انحرافات بھی فور گرااؤنڈنگ کی توسیع ہیں۔ لغت سے تجاوز کرتے ہوئے جب نئے نئے الفاظ و تراکیب وضع کیے جاتے ہیں تو اُن کا بڑا مقصد تجریدی جذبات و احساسات کی ترجمانی ہوتا ہے اور اس کا حصول اُسی وقت ممکن ہے جب روایتی پیٹرن کو چھوڑ کر تخلیقی اُپج اور انحراف کو اپنایا جائے، یہ تمام نئے انداز اس فور گراؤنڈنگ کے تحت ہی وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اُسلوب کے تمام خارجی اور داخلی انحراف یہاں زیرِ بحث آتے ہیں اور یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ مجاز کے تمام علاقے اصل میں اُسلوبیات کی اقلیم کا ناگزیر حصہ ہیں۔ ہر زبان کا ایک مخصوص ضابطہ یا قاعدہ ہوتا ہے جو روز مرہ بول چال میں باہمی تفہیم اور افادے کی بنیاد پر فعال رہتا ہے، اس کی مدد سے مخاطب اور سامع میں کسی قسم کا مغالطہ پیدا نہیں ہوتا۔ کہنے والا جو کچھ کہتا ہے سننے والا وہی سمجھ رہا ہوتا ہے۔ ایسی گفتگو میں الفاظ عموماً لغوی حد بندیوں کو تسلیم کرتے ہیں جس کی وجہ سے ہمارے روزانہ کے معاملات میں کوئی ابہام یا رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی کیوں کہ اس نوع کی تحریر یا گفتگو میں فور گراؤنڈنگ کا عمل وقوع پذیر نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس تخلیقی زبان کی تمام تر کرشمہ سازیاں فور گراؤنڈنگ پر اُستوار ہوتی ہیں۔ ہر زبان میں تخلیقی اظہار کے بے شمار امکانات پوشیدہ ہوتے ہیں اور جو تخلیق کار جتنا زیادہ ان امکانات کو برت سکتا ہے اُس کی تحریر میں معنوں کی دنیا بھی پھیلتی چلی جاتی ہے۔ اُردو زبان و ادب میں اُسلوبیاتی تنقید بڑی تیزی سے اپنی جگہ بنا رہی ہے۔ جدید تنقیدی رجحانات نے متن کی تفہیم اور تجزیے کی جو نئی راہیں دریافت کی ہیں اُن میں اُسلوبیاتی تنقید کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ قاسم یعقوب اس نئی تنقیدی روش کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "اُسلوبیاتی تنقید، تنقید کی وہ شاخ ہے جس میں کسی فن پارے کے لسانیاتی نظام کو گرفت میں لینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جو تخلیقی کارگزاری میں ایک نامیاتی عمل کے طور پر شامل ہوتا ہے۔ اُسلوبیاتی تنقید

اُس نظام کا تجزیہ کرتے ہوئے اُن امتیازات کو نشان زد کرتی ہے جس سے فن پارہ ایک مختلف تخلیقی شناخت قائم کرتا ہے۔ ادبی تنقید کا بنیادی تفاعل ادبی جمالیات کی نشان زدگی ہے۔۔۔اُسلوبیاتی تنقید، ساختیاتی تنقید کی طرح متن بنیاد ہوتی ہے۔ اسلوبیاتی تنقید، تنقید کا نظری ماڈل نہیں۔ یہ اطلاقی لسانیات کی ایک شاخ کہلائی جاتی ہے۔"(۲۰)

اُسلوبیاتی تنقید کسی ادب پارے کا مجموعی تعارف یا تجزیہ پیش نہیں کرتی بلکہ صرف اُس کی لسانی جہتوں کی عقدہ کشائی کرتی ہے۔اس کا کام فکر و نظر کے صغرے کبرے تلاش کرنا نہیں ہوتا اور نہ ہی سماجی اور ثقافتی معاملات میں اس کی کوئی مداخلت سامنے آتی ہے۔ اُسلوبیاتی تنقید کا منصب تخلیقی متن میں لسانی صفات کی تلاش و جستجو ہے۔ یہاں لفظ کی صوتی اور معنیاتی سطحوں کا تجزیہ اور مطالعہ کیا جاتا ہے۔ متن میں اظہار کے قرینے چوں کہ جملوں کی صورت میں سامنے آتے ہیں لہٰذا جملوں کی نحوی اور قواعدی ساخت کا عمل بھی اسی تنقید کی حدود میں شامل ہے۔

اگر معاملہ شعری تنقید کا ہو تو پھر اُس میں بحروں کے تجزیات کے علاوہ حروف کی آوازیں، صوتی ارکان، حروفِ علت، مصمتہ، مصوتہ، کھلے رکن، پابند رکن، ردیف، قوافی، شعری صنف، الفاظ کی تکرار اور تضاد کی صورتوں کا بھی عمیق تجزیہ کیا جاتا ہے۔ صوتی آہنگ کے تحت مصرعے کی صفیری، ہکاری اور معکوسی آوازوں کو نشان زد کیا جاتا ہے۔ جملوں یا مصرعوں کی اسمیہ اور فعلیہ حالتوں کا بیان بھی اُسلوبیاتی تنقید کا ناگزیر حصہ ہے۔اُسلوبیاتی تنقید کے شعری تجزیات اس حد تک سائنسی اور معروضی ہیں کہ ہر تجزیے کو شماریاتی مراحل سے گزار کر ایک جامع اور مبسوط نتیجہ مرتب کیا جاسکتا ہے۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب "ادبی تنقید اور اُسلوبیات" میں شامل اپنے مضامین، "اُسلوبیاتِ میر"، "اسلوبیاتِ انیس" اور "اُسلوبیات اقبال" میں اُسلوبیاتی تنقید کے ایسے تفصیلی مطالعات پیش کر دیے ہیں جن سے ہر شخص رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔

اُسلوبیاتی تنقید میں اسی اندازِ نظر نے توازن اور اعتدال کی کیفیت پیدا کی ہے۔ ہر فن پارہ اپنی ذات میں خود مکتفی ہونے کے باوجود کچھ ضمنی اور لازمی نسبتی مظاہر بھی رکھتا ہے۔ جیسا کہ فن پارے میں حقیقی دنیا اور تخلیقی دنیا کی باہمی نسبت اور اُس کے مظاہر۔ یہی نسبت اصل میں ادیب، قاری، تخلیق، تجربے اور زبان کے درمیان بھی قائم رہتی ہے۔ ادب پارے کے یہ تمام باہمی رشتے جمالیات پر انحصار کرتے ہیں، کیوں کہ قاری اور متن کے رشتے میں جمالیات کی یہی مجموعی فضا اصل میں تفہیم و تجزیات کی راہ ہموار کرتی ہے۔ ادبی زبان محض حوالہ نہیں ہو سکتی۔ اگر ادب میں ٹھوس علمی مسائل کی فراوانی در آئے تو وہ تحریر از خود ادبی اقلیم سے باہر نکل جائے گی۔ ادبی متن میں تخیل کی وجہ سے ایک ایسی تخلیقی دنیا کی تعمیر ہوتی ہے جہاں اشیا کی قدر و قیمت کا تعلق اکثر و بیشتر جمالیاتی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے: علی رفاد فتیحی لکھتے ہیں:

"سائنسی مضامین کی زبان سپاٹ اور حوالہ جاتی ہوتی ہے جبکہ اس کے برعکس ادبی زبان کی تخلیقات جمالیاتی خوبیوں سے سجی ہوتی ہے۔ ادبی موضوعات صرف حقیقت کی ترجمانی نہیں کرتے بلکہ ان میں

قوس و قزح جیسی رنگینی شامل ہوتی ہے۔ موضوعاتکی اس رنگارنگی کے اظہار کے لیے ادبی زبان جمالیاتی رنگ و روپ اختیار کر لیتی ہے۔"(۲۱)

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب " ادبی تنقید اور اُسلوبیات " میں اُسلوبیاتی تنقید میں جمالیاتی پہلوؤں کے حوالے سے کوئی ایسی مدلل یا مفصل بات نہیں لکھی جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ وہ اُسلوبیاتی تنقید میں جمالیاتی خصائص کی تلاش و جستجو کے ضمن میں کیا واضح نظریہ رکھتے ہیں لیکن اُن کی تحریروں سے یہ ضرور مترشح ہوتا ہے کہ وہ اُسلوبیات میں جمالیات کی کارفرمائی کو کچھ خاص پسند نہیں کرتے۔ اُن کا یہ بیان توجہ طلب ہے :

"اُسلوبیات کے پاس خبر ہے نظر نہیں ہے، جمالیاتی قدر شناسی اُسلوبیات کا کام نہیں۔ اُسلوبیات کا کام بس اس قدر ہے کہ لسانی امتیازات کی حتمی نشاندہی کر دے۔ ان کی جمالیاتی تعینِ قدر ادبی تنقید کا کام ہے۔ اس کی توقع ادبی تنقید سے کرنا چاہیئے نہ کہ اُسلوبیات سے۔ "(۲۲)

اس کے برعکس اُردو ادب میں اُسلوبیاتی تنقید کے بانی مسعود حسن خان کے بارے میں مرزا خلیل احمد بیگ نے جو معلومات بہم پہنچائی وہ ہمیں تصویر کا دوسرا رخ بھی دکھاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"پروفیسر مسعود حسین خاں نے اپنے مضامین میں اسلوبیاتی تجزیے کی معروضیت (Objectivity) اور اس کے سائنسی انداز کے ساتھ ساتھ اس کے جمالیاتی پہلوؤں پر بھی زور دیا ہے اور ادب کے لسانیاتی تجزیے میں رچے ہوئے ذوق کی ضرورت کو تسلیم کیا ہے یعنی اسلوبیاتی نقاد فن پارے کے اسلوبی خصائص اور دیگر لسانی جمالیاتی باریکیوں کیاسی وقت شناخت کر سکتا ہے جب اس کے اندر ادب کا رچا ہوا ذوق بھی ہو۔"(۲۳)

اسی اقتباس کا یہ حصہ بھی دعوتِ فکر دیتا ہے :

"پروفیسر مغنی تبسم بھی اُ سلوبیاتی تنقید میں ادبی ذوق کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں ایک اچھا اسلوب شناس وہی ہے جو ادب کا سچا ذوق بھی رکھتا ہو ورنہ محض لسانیاتی اوزاروں (Tools Linguistic) سے کام لینے سے فن پارے کا تجزیہ میکانکیت کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے ذوق کی اہمیت کو ہمارے مغربی اسلوبیاتی نقادوں نے بھی تسلیم کیا ہے اسی لئے وہ اسلوبیات کو ادبی مطالعہ و تجزئے کا لسانی جمالیاتی رویّہ یعنی (Lingua- Aesthetic approach) قرار دیتے ہیں۔"(۲۴)

حقیقت یہی ہے کہ اُسلوبیات کے تمام معیاری نظریے اور تجزیے جہا ں لسانیات کے تکنیکی اور معروضی وسائل کو کام میں لاتے ہیں وہاں ادبی جمالیات کے مظاہر بھی اُن کے پیشِ نظر ہوتے ہیں۔ اُسلوبیات کوئی جامد تنقیدی رویہ نہیں ہے کہ اس میں پہلے سے طے شدہ نظریات حرفِ آخر کا درجہ رکھتے ہیں بلکہ اُسلوبیاتی تنقید میں تخلیقی جہات سے صرفِ نظر کرنا کسی طرح بھی ممکن نہیں ہو سکتا۔ اگر ایک ناقد

اُسلوبیات میں جمالیات کو خارج کرتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں بنتا کہ اُسلوبیاتی اقلیم میں جمالیات کا داخلہ ممنوع ہے۔ کئی اور اہم نقاد اُسلوبیاتی تنقید میں جمالیات کو شامل بھی سمجھتے ہیں۔ اُسلوبیا تی تنقید کے بنیادی مباحث اُس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتے جب تک کہ اُسلوبیات کی تمام اقسام کو سامنے نہ لایا جائے۔ یہ اقسام مشرقی اور مغربی ناقدین کی کتابوں میں بکھری پڑی ہیں۔ طارق سعید نے اپنی گر اں قدر تصنیف " اُسلوب اور اسلوبیات " میں ڈاکٹر گن پتی گپت، آر ڈی بلیک مین اور ایچ ڈبلیو جانسن کی کتابوں اور مقالات سے استفادہ کرنے کے بعد اُسلوب کی درج ذیل اکیس اقسام کی نشان دہی کی ہے :

۱۔ تعقیدی اُسلوب
۲۔ مذہبی اُسلوب
۳۔ مقفیٰ، مسجع اُسلوب، مرجز اُسلوب
۴۔ تمثیلی، حکایتی اُسلوب
۵۔ رنگین مرصع اُسلوب
۶۔ محاوراتی اُسلوب
۷۔ بنیادی اسلوب
۸۔ سپاٹ و سادہ اُسلوب
۹۔ بیانیہ اُسلوب
۱۰۔ توضیحی اُسلوب
۱۱۔ انانیتی اُسلوب
۱۲۔ شگفتہ یا تاثراتی اُسلوب
۱۳۔ طنزیہ یا ظرافت آمیز اُسلوب
۱۴۔ خطیبانہ اُسلوب
۱۵۔ حکیمانہ، فلسفیانہ اسلوب
۱۶۔ مرقع نگاری یا محاکاتی اُسلوب
۱۷۔ استعاراتی اُسلوب
۱۸۔ اُسلوب جلیل
۱۹۔ علامتی اُسلوب
۲۰۔ ہیجانی، ماورائی یا منتشر خیالی کا شکستہ اُسلوب
۲۱۔ امتزاجی اُسلوب (۲۵)

اسالیب کا یہ تقسیم جامع تو نہیں تاہم اس کی مدد سے یہ ضرور کہا جاسکتا ہے اُسلوب اپنی نوع اور تنظیم کے اعتبار سے تکنیکی، موضوعی، تخلیقی اور جمالیاتی ہو سکتا ہے اور اس پر نفسیات، سماجیات، معاشیات اور جمالیات کے اثرات خاصے گہرے ہوتے ہیں۔ ارسطو کے زمانے سے لے کر بہت بعد تک اُسلوب کی درجہ بندی صرف چست اور ڈھیلے اُسلوب تک محدود تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ جہاں فن پارے کی تفہیم اور تجزیات کی نئی نئی راہیں سامنے آئیں وہاں اُسلوبیات کی علمی بحثوں نے فکر و نظر کے کئی نئے در بھی وا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ سید محمود الحسن اسی نکتے کو مزید واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "موجود دور میں وسعتِ مطالعہ کے ساتھ ساتھ ژولیدگیءافکار، ادب کو سمجھنے اور سمجھانے میں سائنس و تکنیک کی ایسی گرہیں پیدا کرتا جا رہا ہے کہ تجربہ کا کوئی قطعی اور مستحکم اصول قائم کرنا مشکل بن گیا ہے۔ نقاد محض روایتی اثر انگیزی یا تاثر پذیری کے نرم و نازک دھاگے کے ذریعے قاری اور تصنیف کے درمیان جذباتی اور فکری رشتہ تلاش کرنے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ اس فکر میں سرگرداں ہے کہ تنقید کا کوئی ایسا نظام قائم کر دے جو ادبی تجزیے کو سائنس کے مرتبے تک پہنچا دے۔ جدید تنقید میں اُسلوبیاتی دبستان اسی کاوش کا نتیجہ ہے"(۲۶)

جدید اُسلوبیاتی تنقید نے متن میں موجود لسانی صداقت کی طرف جس انداز سے توجہ مبذول کی اُس کی وجہ سے تخلیقی عمل کا جوہر کشید کرنے میں آسانی ہو گئی ہے۔ اُسلوب کو نظر انداز کر کے ہم کسی ادب پارے کو سمجھ بھی نہیں سکتے۔ اُسلوبیاتی تنقید نے ادب کی حدود کو وسعت آشنا کر دیا ہے اور اب اُسلوب کو محض لفظ و صوت کا مجموعہ نہیں سمجھا جاتا بلکہ ایک تخلیق کار کی شعوری اور لاشعوری واردات کو منکشف کیا جاتا ہے۔ پروفیسر عبدالحق لکھتے ہیں:

> "ہنر مندی کے تمام ذرائع سیرت کے تابع ہیں۔ اُسلوب کا تعین اور تشکیل کی اساس بھی سیرت پر قائم ہے۔ ادبیات عالم کے مطالعہ کے بعد یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ بڑے شہکار کے اسالیب میں خود فنکار کی سیرت کی جلوہ سامانی تاب کار حیثیت رکھتی ہے۔ ذخیرہ الفاظ، آہنگ، تراکیب، تصوارت اور اختراعات میں اس کی اپنی شخصیت کی رونمائی عام ہے۔ مکروہ یا ناپسندیدہ سیرت کے مالکوں کی اعلیٰ تخلیق بھی اسالیب کے معمولی میزان پر نہیں رکھی جاسکتی اور نہ انھیں یادداشت میں محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔"(۲۷)

اُسلوب کے روایتی مباحث ہوں یا اُسلوبیات کے جدید افکار و نظریات ان سب میں شخصیت کا حوالہ ضرور آتا ہے۔ اُسلوبیات نے شخصیت کی کھوج لگانے میں بھی اہم وسائل مہیا کیے ہیں۔ شخصی انفرادیت کی کھوج کا یہ عمل موضوع کے بجائے متن کی ہیئت اور لسانی و اُسلوبی خصائص پر توجہ کرتا ہے۔ یہ مطالعہ اتنا عمیق اور ہمہ گیر ہوتا ہے کہ شخصیت کا بطون منکشف ہونے کے علاوہ اُس مخصوص عہد کا نقشہ بھی سامنے آجاتا ہے جس میں وہ تصنیف وجود پذیر ہوئی تھی۔ یہ سارا مطالعہ متن کی ظاہری یا معروضی حوالے سے ہوتا ہے۔ اس اندازِ نقد

میں اُسلوب کے آہنگ، مزاج، لسانی ترجیحات، فنی جہات اور برتاؤ کو کچھ ایسی مہارت سے پرکھا جاتا ہے کہ متن میں موجود فکر کی صحت و جامعیت پر بھی روشنی پڑتی ہے (اگرچہ فکر کی پرکھ اُسلوبیات کا منصف نہیں ہے)۔ اُسلوبیات کے جدید مباحث میں وسعت کا یہ عالم ہے کہ اب اس کے ذریعے مصنف اور متن کے بارے میں ایسے ایسے انکشافات کیے جاسکتے ہیں جو اس سے قبل ممکن نہیں تھے۔

اُسلوب کے روایتی مباحث میں خیال اور الفاظ سے وابستہ تمام امور مثلاً اختصار، سلاست، سادگی، زورِ بیان، پختگی، پرکاری، مبالغہ آرائی اور خوش آہنگی پر توجہ صرف کی جاتی تھی۔ یہ امور صرف تاثراتی بنیادوں پر اپنا معاملہ طے کرتے تھے اور ہر صاحبِ ذوق اپنی ذاتی پسند اور ناپسند کے تحت نتائج مرتب کرتا تھا۔ اُردو تنقید میں تاحال یہ روش عام ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ نقاد جسے چاہے بڑا ادیب بنا کر پیش کر سکتا ہے اور جسے چاہے اقلیمِ ادب سے خارج بھی کر سکتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تنقید کی اسی روش نے اُردو تنقید کو جوان نہیں ہونے دیا۔ اُردو تنقید کے اسی انتشار نے ادبی تنقید کی ساکھ پر منفیت کا رنگ غالب کر دیا تھا۔ یہ روش نہ جانے کب تک آگے چلتی رہتی لیکن بیسویں صدی میں جہاں علم و فنون کے تازہ افکار نے تخلیقی ادب کو متاثر کیا ہے وہاں تنقید نے بھی اس کے گہرے اثرات قبول کیے ہیں۔ عصر حاضر میں متن کے خارجی اور داخلی مظاہر کی تفہیم و تشریح میں جو نئے پیراڈائم سامنے آئے اُس کی وجہ سے نقاد کی من مانی ختم ہو گئی ہے اور اُس کی جگہ ٹھوس علمی نظریات روز بروز مستحکم ہوتے چلے جارہے ہیں۔ اب وہی نقاد معتبر سمجھا جائے گا جو عصر حاضر کی علمی ادبی روایات سے پوری طرح باخبر ہو گا، اور ایسے نقادوں کی اجارہ داری ختم ہو جائے گی جو اپنی ذاتی پسند اور ناپسند پر بڑے بڑے فیصلے صادر کیا کرتے تھے۔ اُسلوبیاتی تنقید اسی جدید تنقید روش کی آئینہ دار ہے۔

مغرب میں اُسلوبیاتی مباحث کی عمر ایک صدی سے زائد ہو چکی ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اُردو زبان و ادب میں بھی ناقدین کی ایک بڑی تعداد اس طرف متوجہ ہو چکی ہے اور اُن کی تحریروں میں اُسلوبیات کا ذکر معمول کی بات بن چکی ہے۔ وہ زمانہ ختم ہوتا جارہا جب ادبی تنقید میں مصنف کی ذات اور اُس کا عہد پیشِ نظر ہوتا تھا۔ جدید تنقید نے بین العلومی روش کو اپنالیا ہے جس کی وجہ سے لسانیات، فلسفہ، نفسیات، عمرانیات، تاریخ، بشریات اور نیوروسائنس کے مطالعات بھی ادبی تنقید میں شامل ہو چکے ہیں اور مزید علوم کا عمل دخل بھی ادبی فضا میں وسعت پیدا کر رہا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ برجموہن دتاتریہ کیفی، کیفیہ، انجمن ترقی اردو پاکستان، 1950ء، ص60

۲۔ اقتدار حسین خان، ڈاکٹر، لسانیات کے بنیادی اُصول، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1985ء، ص15

۳۔ محمد ہادی حسین، زبان اور شاعری، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1984ء، ص79

۴۔ محی الدین قادری زور، ہندوستانی لسانیات، نسیم بک ڈپو، لکھنو، 1991ء، ص26

۵۔ خلیل صدیقی، لسانی مباحث، زمرد پبلیکیشنز، کوئٹہ، 1991، ص11

۶۔ خلیل صدیقی، لسانی مباحث، زمرد پبلیکیشنز، کوئٹہ، 1991، ص13

۷۔ خلیل صدیقی، لسانی مباحث، زمرد پبلیکیشنز، کوئٹہ، 1991، ص18

۸۔ مرزا خلیل احمد بیگ، اردو میں لسانی تحقیق، مشمولہ نقوش، شمارہ نمبر 142، مکتبہ نقوش، 1996ء، ص135

۹۔ محی الدین قادری زور، ہندوستانی لسانیات، نسیم بک ڈپو، لکھنو، 1991ء، ص17

۱۰۔ حامد اللہ ندوی، ڈاکٹر، اردو زبان کا تاریخی خاکہ، مشمولہ اردو تاریخ و مسائل، مرتبہ سید روح الامین، عزت اکادمی، گجرات، 2007، ص35

۱۱۔ محمد اشرف کمال، ڈاکٹر، لسانیات، زبان اور رسم الخط، روہی بکس، 2016ء، ص128-126

۱۲۔ خلیل صدیقی، لسانی مباحث، زمرد پبلیکیشنز، کوئٹہ، 1991، ص5

۱۳۔ محی الدین قادری زور، ہندوستانی لسانیات، نسیم بک ڈپو، لکھنو، 1991ء، ص21

۱۴۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، ساختیات ایک تعارف، پورب اکادمی، اسلام آباد، 2011ء، ص131

۱۵۔ عبد المغنی، ڈاکٹر، اسلوبِ تنقید، عاکف بک ڈپو، دہلی، 1989ء، ص5

۱۶۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، تنقید کے نئے ماڈل کی جانب، مشمولہ معاصر اردو تنقید، مرتبہ، شارب ردولوی، اردو اکادمی، دہلی، 1994، ص22

۱۷۔ خورشید جہاں، ڈاکٹر، جدید اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات، منشا پبلی کیشنز، ہزاری باغ، دہلی، 1989ء

۱۸۔ ڈاکٹر رفعت اختر خاں، اردو تنقید پر عالمی اثرات، انیس کتاب گھر، ٹونک راجستھان، 2005ء

۱۹۔ نصیر احمد خان، ڈاکٹر، ادبی اسلوبیات، پورب اکادمی، اسلام آباد، 2013ء، ص11، 12

۲۰۔ قاسم یعقوب، تنقید کی شعریات، پورب اکادمی، اسلام آباد، 2014ء، ص202

۲۱۔ علی رفاد فتیحی، اسلوبیاتی تنقید، مکتبہ جامعہ، دہلی، 1989ء، ص66

۲۲۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، ادبی تنقید اور اسلوبیات، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2008ء، ص19

۲۳۔ مرزا خلیل احمد بیگ، اسلوبیاتی تنقید: نظری بنیادیں اور تجزیے، قومی کونسل برائے فروغ اردو، دہلی، 2014، ص139

۲۴۔ مرزا خلیل احمد بیگ، اسلوبیاتی تنقید: نظری بنیادیں اور تجزیے، قومی کونسل برائے فروغ اردو، دہلی، 2014 ص139

۲۵۔ طارق سعید، اسلوب اور اسلوبیات، نگارشات، لاہور، 1998ء، ص254، 355

۲۶۔ سید محمود الحسن (اقتباس) مشمولہ، اسلوب اور اسلوبیات، طارق سعید، نگارشات، لاہور، ص 10

۲۷۔ عبد الحق، پروفیسر (اقتباس) مشمولہ، اسلوب اور اسلوبیات، طارق سعید، نگارشات، لاہور، ص 15

☆☆☆☆☆